Oriental College Magazine, Vol.101, No. 01, Serial No. 379, 2025

غالب کی شاعری میں فلسفۂ وجودیت

حافظ اعجاز حسین
لیکچرار اُردو، کیڈٹ کالج، جھنگ
عرفان احسن پاشا، پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور

PHILOSOPHY OF EXISTENTIALISM IN GHALIB’S POETRY

Hafiz Ijaz Hussain
Lecturer in Urdu
Cadet College, Jhang

Irfan Ahsan Pasha, PhD
Assistant Professor of Urdu
University of Education, Lahore

Abstract

Existential thinking established as a result of the World War one and two. Kerkigarrd is consider to be the father an founder of Existencial theory. Jean Paul Sartre extended his teachings to a larger extent. Hindi Indian subcontinent Ghalib is the product of Colonial Era which resulted in a huge human tragedy. Life was circled down for the natives.There identity, culture, religion, language and civilization was deformed and deshaped. Ghalib directly and indirectly felt this cruelty from the core of his heart. Existentialism, though, was not the product of that era, It penetrated indirectly in Ghalib's poetry. it is because of the same motivs Which are present in Ghalib's era and Existencial age alike. Ghalib was upset by the hardships of his contemporary circumstances. This article deals with the same perspective of Ghalib's poetry with special context of existentialism

Keywords:
World War, Kerkigarrd, Ghalib, Existentialism, Culture

وجودیت فکر و فلسفہ کی ایک تحریک ہے جس کا مرکزی مقام انسانی وجود کی ہیشگی ہے۔ زمانۂ جدید میں ابھرنے والی فلسفیانہ معاشی، معاشرتی اور مارکسزم جیسی تحریکوں کے ساتھ وجودیت بھی زمانہ جدید کی پیداوار ہے۔ جو ہیگل کے تصور "عقلیت" کے ردِ عمل میں سامنے آئی۔ یہ مذہب، سائنس، عقل اور منطق کی نفی کرتی ہے۔ وجودیت کی اصطلاح کی اساس جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں ہیں۔ اردو ادب نے اسے انگریزی ادب سے لیا۔ جسے وہاں (Existentialism) کہتے ہیں۔ سلطان علی شید ارقم طراز ہیں:

> "وجودیت اس افلاطونی فلسفے کی ضد ہے جو عام موجودات سے آنکھیں پھیر کر اشیاء کی ماہیت یا ان کے جوہر کو حقیقت سمجھتا ہے اور اسی کو تفکر و ادراک کا واحد مقصد ٹھہراتا ہے۔"(۱)

یہاں ہم وجودی افکار و خیالات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے غالب فہمی آسان ہو جائے گی۔

وجودیت کی دو بنیادی اقسام ہیں: مذہبی وجودیت جس کا نمائندہ کرکیگارڈ ہے دوسری قسم دہری وجودیت ہے۔ ژاں پال سارتر اس تحریک کے نمائندہ فلسفی ہیں۔ کرکیگارڈ نے انیسویں صدی میں اس آواز کو بلند کیا اور وجود کو جوہر پر مقدم قرار دیا۔ اس زمانے میں اس نعرے کو خاص پذیرائی حاصل نہ ہو سکی لیکن بیسویں صدی میں جب انسانیت سوزی عام ہوئی تو کرکیگارڈ کی فکر کو تقویت ملی۔ بیسویں صدی میں ژاں پال سارتر نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور انسانی وجود کی ساخت و شناخت کو اہمیت دی۔ اس کے خیال میں انسان کو پیدائش کے بعد اپنی قدر و حیثیت خود متعین کرنی ہوتی ہے۔ وہ بوقت پیدائش یہ سوال لے کر آتا ہے کہ انسان تو ہے لیکن کس طرح کا انسان اس سوال کے راز کو اسے خود تلاش کرنا ہوتا ہے۔

وجودی فلسفے میں اجتماعیت کے مقابل انفرادیت پر زور دیا گیا۔ خارج کی بجائے باطن پر توجہ مرکوز کی گئی۔ معروض سے نجات پا کر موضوعیت کی طرف رجحان سازی ہوئی۔

بیسویں صدی کو تغیراتی صدی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جدید سائنسی، صنعتی اور کمپیوٹر کی ترقی نے انسانی وجود کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اس دور نے کائنات میں بسنے والوں کی سوچ اور اور فکر و خیال کو یکسر بدل دیا۔ انسانی زندگی اگر آسان ہوئی، آرام و آسائش کا سامان مہیا کیا گیا، وہی دکھوں، تکلیفوں، مصیبتوں، جنگ و جدل، قتل و غارت، سرمایہ کی کشمکش اور خون ریزی جیسے بے شمار مسائل کا حملہ ہوا جس سے انسانی وجود منہدم ہوا۔ آگے بڑھنے کی دوڑ نے کمزور متوسط اور پیچھے رہ جانے والے طبقات کو کچل دیا۔ انسانی وجود اس قدر بے معنی و بے قدر ہوا کہ گلی کوچوں، بازاروں، شہروں شہروں، ملکوں ملکوں بے یار و مددگار پھرنے

لگا۔ باہم میل جول اور یک جہتی کا شیرازہ بکھرا۔ ایسے میں انسان نے خود کی پہچان اور قدر و حیثیت متعین کی اور باضابطہ طور پر وجودی تحریک کو جنم دیا۔ افراتفری اور کساد بازی کے اس عالم میں جنم لینے والے مسائل جسے ہم وجودی اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں، ناامیدی، مایوسی، موت، بیگانگی، مغائرت، تنہائی، قنوطیت، احساس محرومی، گھن، خوف، عدمیت، اکتاہٹ، بے یقینی اور اضطراب وغیرہ ہیں۔ زمانہ غالب میں وجودی افکار و خیالات کے باقاعدہ حدود و قیود اور اصول و ضوابط نہیں تھے۔ لیکن اگر ہم غالب کی ذہنی آبیاری کے زمانے کی تفہیم کریں جس میں انہوں نے لفظ و معنی کا طلسم کھیلا تو سمجھ آتی ہے کہ وجودی تحریک کو جنم دینے والے عناصر اور زمانہ غالب ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

برصغیر پاک و ہند پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ ہر طرف افراتفری، بے سکونی، لوٹ مار قتل و غارت کا عالم تھا۔ نو آبادیاتی تسلط گزرتے دن کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں پر بھاری ثابت ہو رہا تھا۔ مسلمان حکومت کا سورج روبہ زوال تھا۔ تخت بہادر شاہ ظفر آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس ضمن میں محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> ”خود غالب کی حالت یہ تھی کہ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ سامان زیست کی کمی اور قدر دانی کی قلت نے تمام امیدوں کا خون کر رکھا تھا۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی ایک مجبوری اور حیات بشری ایک کلفت تھی وہ طمانیت قلب، صحت اور راحتِ جسمانی کے لیے ترستے تھے۔“(۲)

درج بالا بحث سے ہم زمانہ غالب اور وجودی فکر و خیال کی ہم آہنگی جان چکے ہیں۔ آیئے اس بحث کے تناظر میں غالب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں تردد نہیں کہ ہر بڑا شاعر بیک وقت حال، ماضی اور مستقبل کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کی شاعرانہ فکر داخلی کیفیتوں کے ساتھ خارجی حقیقتوں کی بھی ترجمان ہوتی ہے۔ اجتماعیت (گروہ) کے ساتھ ساتھ انفرادیت (فرد) بھی اس کا موضوع ہوتا ہے۔ وجودیت بھی اسی فکر کا نام ہے۔

غالب کے ہاں بھی انفرادیت کو دوام حاصل ہے۔ اپنی ذات میں گم نظر آتے ہیں۔ دنیا ان کے سامنے دودھ پیتے بچے کی مانند ہے۔ جس کا اس کے وجود سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کے وجود کی اپنی الگ شناخت ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے(۳)

دنیا اس قدر ان کے سامنے بے معنی ہے کہ وہ دنیا (جوہر) سے اپنے فن کی داد و تحسین کی تمنا نہیں کرتے۔ میرے اشعار بے معنی ہی سہی لیکن میرا وجود تو بامعنی اور قائم ہے۔ وجودی تحریک کے ادیب و شاعر بھی انفرادیت کی بات کرتے ہیں۔ وہ قاری سے رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ وہ کسی اور کے لیے نہیں اپنے لیے لکھتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر اسی بات کا عکاس ہے۔ اسے قاری سے کوئی غرض نہیں وہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں داد و تحسین کی کیا معنویت ہے؟ بنیادی معنویت تو میرے وجود کی ہے جو بغیر کسی شاباش کے قائم ہے:

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی ، نہ سہی(۴)

یہ نہیں کہ میں سوچتا ہوں (تخلیق کرتا ہوں) تو میرا وجود ہے I think therefore I am بلکہ پہلے میرا وجود ہے بعد میں میری سوچ یعنی جوہر I am therefore I think۔ ڈیکارٹ کا نظریہ بھی یہی تھا لیکن بعد کے وجودیوں نے اسے نفی کیا۔ لیکن ایک شعر میں وہ اپنے فن کی ناقدری اور قدر دانوں کی کمی کی وجہ سے وجودی اصطلاح مایوسی کو جنم دیتے ہیں:

یار جا وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور(۵)

کرکیگارڈ جو وجودیت کا باوا آدم ہے۔ "وجود کو جوہر پر مقدم" قرار دیتا ہے۔ آیئے غالب کے ایک شعر سے اس آواز کی حقیقت جانتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا(۶)

پہلا مصرعہ بغیر کسی عقلی و منطقی دلیل کے خدا کی ذات کا اثبات ہے اور موجود ہونے پر دلالت کرتا ہے جو وجودیوں کے ایک گروہ (مذہبی وجودی) کا مرکز نگاہ ہے۔ غالب کے اس مصرعے سے کرکیگارڈ کے تصور خدا کو تقویت ملتی ہے۔ وہ (کرکیگارڈ) خدا کی ذات کو عقل، فلسفہ اور منطق سے ثابت کرنے سے منع کرتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں غالب اپنے ہونے کے بارے میں سوال پیدا کرتا ہے۔ "نہ ہونا" مرکز ہے جو وجود کا اثبات ہے۔ میرے ہونے نے مجھے ڈبویا اگر میں نہ ہوتا یعنی وجود نہ ہوتا اور نہ ڈوبتا تو پھر "کیا ہوتا" سوال جنم دیتا ہے۔ یعنی اگر میں وجود نہ ہوتا تو کیا جوہر ہوتا؟ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے لیکن غالب عرفان ذات کے متلاشی ضرور ہیں۔

شاعر کے ہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ اس کی ماہیت و ہیئت کیا ہے؟ اس کی وجودیاتی تعبیر کیا ہے۔ انتخاب اور آزادی کا کس دائرے تک متمنی ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا(۷)

موت کا خوف ازل سے اپنی جگہ قائم ہے اور انسان کے اندر ہمیشہ مقیم ہے۔ یہ ایک داخلی صورت بھی ہے اور خارج سے متعلق بھی۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ دوامی فیصلہ ہے تو ہم اس سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ شاعر متصوفانہ طرز میں موت کی معنویت کو موت سے پہلے ہی سمجھ چکے ہیں اور اس جانکاری میں دیگر وجودی کیفیات بھی در آئی ہیں جس میں کرب، موت، پریشانی، یاسیت وغیرہ۔ ان تمام کیفیات سے خلاصی موت کی صورت میں ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟(۸)
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی میرا رنگ زرد تھا(۹)
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟(۱۰)

وجودیت کے نعرہ اجتماع سے انفراد کی طرف ہے۔ سارتر نے گروہ کو جہنم قرار دیا ہے۔ غالب کا سفر بھی اجتماع سے انفراد کی طرف ہے اور آزادی کے متمنی ہیں جو وجود کو اثبات بخش سکتی ہے۔ غالب گروہ سے خوف، وحشت جیسی کیفیات کو جنم دیتے ہیں اور اس سے خلاصی دوستوں، عزیز و اقارب اور جملہ احباب سے ممکن نہیں۔ انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی اس کا چارہ ساز و غمگسار نہیں، اس کے دکھ درد میں شریک نہیں تو اس کے اندر مایوسی کا احساس جنم لیتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنی ذات میں کھو جاتا ہے اور تنہائی

میں پناہ لیتا ہے:

رہیے ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو(۱۱)

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال ، بیاباں نورد تھا(۱۲)

تنہائی وجودی فکر کا اہم جزو ہے جس سے دیگر وجودی کیفیات یاس، غم، اضطراب، کرب، پریشانی جیسی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ غالب جیسا شعری استعداد رکھنے والا اس کیفیت میں شعر کہہ سکتا ہے جس سے ہر دفعہ معنویت کے نئے درواہوتے ہوں۔ غالب کے ہاں تنہائی محبوب سے بچھڑنے کے ساتھ ساتھ وجودی کیفیات کا احساس بھی دلواتی ہے۔ کرکیگارڈ کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ وہ خود کو تنہا سمجھتا ہے اور وہ ایسا تنہا پنچھی ہے جو ویران شاخ پر بیٹھا ہے۔ غالب اور فلسفہ وجودیت باہم متصل ہیں۔ کیونکہ ایک عمدہ شاعر بیک وقت فلسفی بھی ہوتا ہے۔ غالب اپنے زمانے کے ناساز حالات کی وجہ سے عوام اور اردگرد سے مایوس اور پریشان رہتے ہیں اور تنہائی جیسی کیفیات کو جنم دے کر اس میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ غالب تنہائی کے اس عالم میں عرفان ذات کی جست لگاتے ہیں اور گم گشتہ ذات کو تلاشتے ہیں۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور کسی گروہ کا حصہ بننے سے گریز کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے(۱۳)

کاؤ کاؤ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا(۱۴)

بعض دفعہ انسان شناختِ ذات سے اس قدر اجنبی ہو جاتا ہے اور پہچان کھو دیتا ہے کہ وہ غور کرنے پر واپس نہیں آتی۔ دنیا کی بھول بھلیوں اور ہٹو بچو کے شور میں غالب خود سے بھی دور نکل گئے ہیں، پہچان کھو بیٹھے ہیں اور گمشدہ ذات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وجود سے عدم واقفیت ، بے ثباتی اور ناپائیداری کا راگ الاپتے ہیں۔ شاعر ذات کی گمشدگی اور خود سے دور نکل جانے کی صورت میں وجودی کیفیت ''اجنبیت'' کا احساس دلواتے ہیں۔ وہ پیدہ شدہ سوال کے جواب کے متلاشی ہیں کہ میں کیا ہوں؟ کہاں سے چلا ہوں؟ کدھر گم ہو گیا ہوں اور کیسے خود کو دریافت کر سکتا ہوں:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی(۱۵)

اے ساکنان کوچہ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے(۱۶)

شاعرانہ حسن یہ ہے کہ اس کے اندر معنوی وسعت ہوتی ہے اور نئے نئے تناظر میں تعبیر کی جا سکتی ہے۔ جو بات ہم نثر میں بیسوں صفحات پر پھیلی سیاہی کی مدد سے نہیں کر سکتے وہ اگر شعر کے قالب میں ڈھال کر کی جائے تو مصرعہ اولیٰ بھی کافی ہوتا ہے جو دریا کو کوزے میں سمیٹ سکتا ہے۔ لیکن غالب کی طرح اس معجزہ فن کی خون جگر سے نمود لازماً کرنی پڑتی ہے۔ غالب ہمیں ماضی میں بھی دکھائی دیتے ہیں، حال اور ذات میں گم بھی نظر آتے ہیں اور آنے والی مختلف فکری تحریکوں اور رجحانات کو بھی سمجھے ہوئے ہیں۔ غالب جیسا آفاقی شاعر ہی آنے والی فکر (وجودیت) کو اپنی شاعری میں جگہ دے سکتا ہے۔ ان کے شعور اور فکر میں کبھی بھی انجماد کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ غالب جیسا حساس ذہن وجودی فکر کے تمام زاویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بجنوری کا کلام غالب کو الہامی قرار دینا آج بھی مستند و مستحکم ہے:

لکھتا ہوں اسد! سوزش دِل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت(۱۷)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، (لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۷۸ء)، ۹۔

(۲) محمد عبداللہ، غالب کے فلسفیانہ افکار، مشمولہ: ماہ نو (غالب نمبر)، کراچی، مارچ ۱۹۹۸ء، ۱۴۳۔

(۳) غلام رسول مہر، دیوان غالب، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول، ۱۹۶۷ء)، ۲۶۴۔

(۴) ایضاً، ۲۳۱۔

(۵) ایضاً، ۹۳۔

(۶) ایضاً، ۵۷۔

(۷) ایضاً، ۲۰۔

(۸) ایضاً، ۲۱۲۔

(۹) ایضاً، ۲۶۔

(۱۰) ایضاً، ۱۵۹۔

(۱۱) ایضاً، ۱۷۸۔

(۱۲) ایضاً، ۲۷۔

(۱۳) ایضاً، ۲۹۰۔

(۱۴) ایضاً، ۲۰۔

(۱۵) ایضاً، ۲۱۲۔

(۱۶) ایضاً، ۲۱۱۔

(۱۷) ایضاً، ۷۷۔

REFERENCES

1. Sultan Ali Sheeda, *Wajudiat Par Aik Tanqidi Nazar*, (Lakhnau: Urdu Acedemy 1978), p9.
2. Muhammad Abdullah, Khalib ky Falsafiyana Afkar, (Incl.) *Mah-e-Nau*, Ghalib number, Karachi: March 1998, p143.
3. Ghulam Rasool Mehar, *Divan-e Ghalib*, (Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons, 1967), p264.
4. ibid, p231. 5. ibid, p93 6. ibid, p 57.
7. ibid, p20. 8. ibid, p212 9. ibid, p26.
10. ibid, p159. 11. ibid, p178. 12. ibid, p27.
13. ibid, p290. 14. ibid, p20. 15. ibid, p212.
16. ibid, p211. 17. Ibid, p77.

❖❖❖